مقالات

اسلام کا فلسفۂ عمران[1]

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ)

انسان اس لحاظ سے حیوانات کا شریک حال ہے کہ اس کو بھی دوسرے جانوروں کی طرح غذا اور پانی کی، مجامعت اور تناسل کی، سردی اور گرمی سے بچنے کی، اور ایسے ہی دوسرے طبیعی امور کی حاجت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام حاجات کو پورا کرنے کے اسباب و وسائل انسان اور حیوان دونوں کے لیے فراہم کر رکھے ہیں۔ اور پھر وہ اللہ ہی ہے جو ہر ایک نوع حیوانی کو اسکی مخصوص نوعیت کے مطابق طبعی طور پر الہام کرتا ہے کہ وہ کس طرح ان اسباب و وسائل سے کام لے کر اپنی حاجت پوری کرے۔ مثلاً وہ شہد کی مکھی کو الہام کرتا ہے کہ وہ کس طرح پھولوں سے رس چوسے، کس طرح شہد بنائے، کس طرح چھتہ تیار کرے، کس طرح اپنے بنی نوع کے ساتھ مل کر رہے اور کس طرح اپنی ملکہ کی اطاعت کرے۔ اسی طرح وہ چڑیا کو الہام کرتا ہے کہ وہ اپنی بھوک کو رفع کرنے کے لیے کونسی چیزیں کس طرح کھائے، اپنی پیاس کو رفع کرنے کے لیے کیا چیز کس طرح پیے، اپنی جان بچانے کے لیے بلّی اور شکرے کے مقابلہ میں کیا تدبیر کرے، اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لیے نر اور مادہ کس طرح ملیں، کیسے گھونسلہ بنائیں، چڑیا انڈے دینے اور سینے کا کام اور چڑا غذا فراہم کرنے کا کام کیسے کرے، پھر بچے ہوں تو وہ ان کو کس طرح پالیں اور کب تک پالنے پوسنے اور انکی حفاظت کرنے کا

[1] یہ مضمون حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اقتباسات کے درمیان ربط پیدا کرنے کے لیے ایسے ٹکڑے لگا دیے گئے ہیں جو شاہ صاحب کے اصل الفاظ میں نہیں ہیں مگر ان کے فلسفہ کی روح کے حامل ہیں۔

فرض انجام دیں۔ اسی طور پر ہر نوع کے لیے ایک شریعت ہے، ایک طریقہ ہے، جس کو فرداً فرداً اس نوع کے ایک ایک شخص کے سینے میں بطریق الہام اتار دیا جاتا ہے۔ اور یہی معاملہ انسان کے ساتھ بھی ہے کہ اسکے مقتضائے فطرت کے مطابق اسکی ساخت بنائی گئی اور اسکی حاجات پوری کرنے کے لیے اسباب و وسائل فراہم کردیے گئے، اور پھر اس کو الہام کیا گیا کہ وہ کس طرح ان اسباب و وسائل سے کام لے کر اپنی ان ضرورتوں کو رفع کرے۔

مگر انسان کی نوعی خصوصیت (یعنی اسکی انسانیت) کے اقتضار سے تین باتیں اس کے لیے ایسی رکھی گئی ہیں جو دوسرے حیوانات کے لیے نہیں ہیں؛

ایک یہ کہ اسکی حاجات محض طبعی جسمانی نہیں ہیں بلکہ وہ ان سے بالاتر چیزوں کی حاجت بھی اپنے اندر پاتا ہے۔ اس کو محض طبعی داعیات مثلاً بھوک، پیاس، شہوت وغیرہ ہی عمل پر نہیں ابھارتے، بلکہ عقلی داعیات بھی ہیں جو اسے کسی ایسے نفع کی طلب یا کسی ایسے نقصان سے بچنے کی کوشش پر ابھارتے ہیں جس کا تقاضا عقل کرتی ہے نہ کہ حیوانی طبیعت۔ مثلاً وہ ایک صالح نظام تمدن مانگتا ہے، تکمیل اخلاق اور تہذیب نفس کی پیاس اپنے اندر محسوس کرتا ہے، دور رس منفعتوں کا تصور کرتا ہے اور انکے لیے قریب کے نقصانات گوارا کرتا ہے، بعید نقصانات کا ادراک کرتا ہے اور ان سے بچنے کی خاطر قریبی فائدوں اور منفعتوں کو قربان کر دیتا ہے، عزت اور شرف اور جمال اور خیر وغیرہ عقلی امور کے متعلق نظریات قائم کرتا ہے اور انکی طلب میں سعی کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسکی فطرت حیوانات کی طرح محض اپنی حاجات پوری کرنے اور انکے لیے اسباب و وسائل سے کام لینے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ ہر چیز میں لطافت اور حسن و خوبی کی طالب ہوتی ہے، اور اسکے بھی کسی خاص مرتبہ کو پہنچ کر ٹھیر جانے پر راضی نہیں ہوتی بلکہ ہر مرتبہ کے بعد کامل تر مرتبے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ مثال کے طور پر حیوانی حاجت محض غذا ہے تاکہ بھوک رفع ہو اور زندگی برقرار رہے۔ مگر

انسانی فطرت اس کے ساتھ لذت کام و دہن اور لطف ذوق و نظر بھی مانگتی ہے، اور پھر تنوع کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ صرف لباس نہیں بلکہ لباس فاخر، صرف مسکن نہیں بلکہ مسکنِ لطیف، اور صرف صنفِ مقابل نہیں بلکہ اس کا حسین و جمیل فرد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

تیسرے یہ کہ جس طرح انسانی حاجات کی نوعیت حیوانی حاجات کی نوعیت سے مختلف ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی کیفیت بھی انسان کے حق میں اُس الہام سے مختلف ہے جو حیوانات پر ہوتا ہے۔ حیوانات کے بخلاف نوع انسانی کے سب افراد پر سب حاجتوں کے بارے میں یکساں الہام نہیں ہوتا بلکہ مختلف قسم کی حاجات کے لیے مختلف اوقات میں مختلف قابلیتوں کے لوگوں پر مختلف طرز کے الہامات ہوتے ہیں جن سے مدد لے کر انسان مفید تر اور صالح تر طریقہائے انتفاع کا استنباط کرتا ہے بعض حاجات سرے سے بعض انسانوں کے سینے میں کھٹکتیں ہی نہیں، اور بعض کے سینوں میں کھٹکتی ہیں۔ پھر جو حاجات بہت سے انسانوں کے سینے میں کھٹکتی ہیں ان کو پورا کرنے کا طریقہ یا بہتر طریقہ ان سب کو الہام نہیں ہو جاتا، بلکہ کسی ایک پر الہام ہوتا ہے اور پھر دوسرے انسان اس سے وہ طریقہ اخذ کرتے ہیں۔ یوں انسانی زندگی میں نئی نئی حاجتوں کا اضافہ ہوتا ہے، ان کو پورا کرنے کے طریقے نکلتے ہیں، اور پھر پچھلے طریقوں سے بہتر طریقے نکلنے کا سلسلہ چلتا ہے۔

یہی تین خصوصیات در اصل انسانی تمدن کی پیدائش اور اسکے اختلاف و تنوع اور اسکے نشو و نما اور ترقی کی بنیاد ہیں۔

اب اگر ذرا زیادہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں خصوصیات کی بنا پر قدرتی اسباب و وسائل سے انسان کے انتفاع اور الہام الٰہی کی رہنمائی کے دو درجے ہیں:۔

پہلا درجہ وہ ہے جس کو اجتماعی زندگی اور مدنیت کا بنیادی ڈھانچہ کہنا چاہیے۔ اسکے بڑے بڑے ارکان یہ ہیں: اداۓ مافی الضمیر کے لیے زبان کا استعمال۔ آلات، اسلحہ اور برتنوں کی صنعت اور ان کا استعمال۔ زراعت، باغبانی اور آبپاشی وغیرہ۔ کھانے کی صنعت۔ لباس کی صنعت۔ مساکن کی صنعت۔ جانوروں

کو مسخر کرنا اور ان سے مختلف کام لینا۔ عورت اور مرد کے درمیان مستقل تعلق جو منزلی زندگی کی بنیاد ہو۔ مختلف حاجات و ضروریات کے لیے انسان اور انسان کے درمیان اجناس یا اموال یا محنت وغیرہ کا مبادلہ۔ قیام امن اور حفظ معاملات کے لیے قانون اور فصل خصومات کی ضرورت۔ حفظ صحت اور بقائے حیات کے لیے دوا اور علاج۔ داخلی معاملات کا نظم قائم کرنے اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرنے کے لیے ایک ریاست کا قیام۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آغاز تمدن سے کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی مرتبہ میں انسانی اجتماعات کی جز ولاینفک رہی ہیں، اور اس بارے میں کسی نہ کسی مرتبے کے الہامات انسان پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں جنکی رہنمائی سے انسان فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور اٹھا رہا ہے۔

دوسرا درجہ اس سے بالاتر ہے اور اس کو تمدن کی صورتِ نوعی کہنا چاہیے جس میں اس کا حُسن یا قبح نمودار ہوتا ہے۔ اس درجہ میں اُس ذوقِ لطافت، اور اُس طلبِ معقولات اور اُس جستجوے کمال کا ظہور ہوتا ہے جسے ہم نے خصوصیات انسانی میں شمار کیا ہے۔ یہاں انسان اپنے معیار لطافت اور اپنے ادراک معقولات، اور اپنے تصورات کمال کے مطابق کھانے، پینے، رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے، ملنے جُلنے کے مختلف آداب اختیار کرتا ہے، اپنے لباس اور اپنے مسکن اور اپنے اسباب زندگی اور اپنے برتاؤ میں شائستگی، طہارت اور زینت کے کچھ اصول معین کرتا ہے۔ اپنے تمدنی معاملات کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتے ہوں یا کسب معاش سے یا سیاست مدن سے یا فصل خصومات سے متعلق ہوں، بہتر طریقہ پر سرانجام دینے کے لیے کچھ اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق ضابطے اور قوانین اور اطوار بنا کر کام کرتا ہے۔ اس درجہ میں دو قسم کے الہام انسان کو دو راستوں کی طرف چلانے کی کوشش کرتے ہیں:

ایک الہام شیطانی، جو اشخاص اور جماعتوں کو خودغرضی، نفس پرستی، عیش پسندی، لذت طلبی، تنگ نظرانہ منفعت خواہی، بغض، حسد، ظلم، شقاوت اور بے اعتدالی کی طرف راغب کرتا ہے۔ لطافت کے معیار، معقولات کے ادراک اور کمال کے تصورات کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے۔ تمدن کی صورتِ نوعی

میں ظاہری چمک دمک مگر باطنی فساد اور بد انجامی پیدا کرتا ہے۔

دوسرا الہام ربانی جو لطافت کا صحیح معیار، معقولات کا سلیم ادراک، اور کمال کا ٹھیٹھ فطری تصور دیتا ہے اور اسی کے مطابق شائستگی، طہارت، زینت اور حسن تدبیر و حسن معاملت کے آداب واطوار معین کرتا ہے۔[۱]

ان مبادی کو ذہن نشین کرنے کے بعد آگے بڑھو۔ انسان اپنی جبلت فطرت کی بنا پر تمام انواع حیوانی سے ممتاز ہے وہ ارتفاع کے پہلے درجے پر قانع نہیں رہتی بلکہ بالارادہ یا بلا ارادہ دوسرے درجے کی طرف پیش قدمی کرتی ہے۔ شائستگی کی کوئی نہ کوئی صورت، کمال کا کوئی نہ کوئی منتہا، اور حسن کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہی ایسا ہوتا ہے جس کی وہ فریفتہ ہوتی ہے اور اسکے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ اس میلان و رغبت سے اپنے آپ کو خالی کرے۔ اسی درجہ میں انسانی جماعتوں کو اس امر کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کوئی حکیم انکی رہنمائی کرے جو انکی حاجت کو سمجھتا ہو اور اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ان کو بتائے۔ یہ رہنمائی کرنے والے حکماء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی فکر اور قوت فہم و ادراک سے حکمت کا استنباط کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے نفس میں اتنی زبردست قوت ملکیہ ہوتی ہے کہ وہ براہ راست ملاء اعلیٰ سے علم و حکمت حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ پہلے گروہ سے افضل ہے، اسکی رہنمائی زیادہ قابل وثوق ہے، اور اسی کی ہدایت سے انسان اپنی فطرت کے مقتضیٰ کو زیادہ صحیح اور مکمل طور پر پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ پہلے گروہ کے کام میں حکمت کے ساتھ جہل اور شیطانی وساوس کی آمیزش بھی ہوسکتی ہے اور ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے یہ لوگ اعتدال قائم نہیں رکھ سکتے۔

پھر ارتفاع کا ظہور جن تمدنی صورتوں اور طور طریقوں میں ہوتا ہے ان کے اندر مفاسد گھس جاتے ہیں، اور ان مفاسد کے گھسنے کا راستہ اس طرح کھلتا ہے کہ ایک طرف تو جماعت کی رہنمائی و سیادت

---

[۱] اقتباس از مبحث ارتفاقات

ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جنہوں نے عقل کلی سے بہرہ نہیں پایا ہے اور یہ لوگ حیوانی، شہوانی یا شیطانی اعمال اختیار کرکے جماعت میں ان کو رواج دیتے ہیں، اور دوسری طرف جماعت میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ان رئیسوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان مفاسد سے تمدن کو پاک کرنے کے لیے بھی ایک طاقت ور شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جسے غیبی تائید حاصل ہو اور جو مصلحت کلیہ کی تابع بھی ہو اور راز داں بھی، تاکہ زندگی کے باطل طور طریقوں کو ایسی غیر معمولی تدبیروں سے حق کی طرف پھیر دے جو بجز تائید غیبی کے آدمی سے بن نہیں آتیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو خدا کی بندگی و عبادت سکھانے کے ساتھ ان کو صحیح طور پر دنیا میں کام کرنے کے اصول بتائے جائیں اور ان کی زندگی کے فاسد طریقے مٹا دیے جائیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بعثت لمحق المعازف (میں لہو و لعب کے آلات کو مٹانے آیا ہوں) اور یہ کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں مکارم اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچانے آیا ہوں) اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ نبی کا کام عقائد اور عبادات کی تعلیم دینے کے ساتھ تمدن کی اصلاح بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اسباب عالم سے کام لینا چھوڑ دیں۔ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی اس کی تعلیم نہیں دی اور روحانی ترقی کا راستہ ہرگز یہ نہیں ہے جیسا کہ اُن لوگوں نے گمان کیا ہے جو سرے سے تمدنی و اجتماعی زندگی کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور وحوش کی سی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ اسی بنا پر جن لوگوں نے قطع علائق کا ارادہ ظاہر کیا ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ما بعثت بالرهبانية وانما بعثت بالحنيفية السمحة (میں رہبانیت لیکر نہیں آیا ہوں بلکہ مجھ کو سیدھی سادی شریعت دے کر بھیجا گیا ہے)۔ پس درحقیقت انبیاء علیہم السلام کو دنیا اور اسکے اسباب سے ترک تعلق کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ دنیا کی زندگی اور اسباب دنیوی سے انتفاع میں صحیح اعتدال پیدا کریں تاکہ انسان نہ تو شاہان عجم کی طرح دنیا پرست بندۂ عیش بن جائے اور نہ غیر متمدن وحشی بن کر رہے۔ خوشحالی ایک

لحاظ سے اچھی چیز ہے کیونکہ اس سے اخلاق میں راستی اور مزاج میں درستی پیدا ہوتی ہے اور انسان کی اُن صفات کو ظاہر ہونے کا موقع ملتا ہے جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہیں۔ دوسرے لحاظ سے خوشحالی بُری چیز بھی ہے کیونکہ وہ انسان کو دنیا کے دھندوں میں پھنسا کر خدا سے غافل اور فکرِ عاقبت سے بے پروا بنا دیتی ہے۔ ان متضاد کیفیات کے درمیان توسط و اعتدال کی صحیح صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کو اسباب دنیوی سے نفع اٹھانے کا پورا موقع دیا جائے مگر اس انتفاع کی بنیاد نفس پرستی پر نہیں بلکہ خدا پرستی پر ہو اور دنیوی کاروبار کے دوران میں بار بار خدا کو یاد دلایا جائے، اور ایسے آداب اور ضوابط مقرر کر دیے جائیں کہ انتفاع اپنی حد سے گذر کر ظلم اور فساد نہ بننے پائے۔

تمدنی معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی کے طور طریقوں پر نظر کی جائے کھانے اور پینے ہیں، لباس اور مکان میں، زینت اور تجمل میں ان کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں؟ ازدواجی زندگی اور خاندانی روابط میں وہ کن قاعدوں پر چلتے ہیں؟ خرید و فروخت اور دوسرے معاملات میں ان کے درمیان کس قسم کے طریقے رائج ہیں؟ جرائم کی روک تھام اور نزاعات کے تصفیہ میں ان کے قوانین کیسے ہیں؟ اسی طرح زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں پر بھی نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ جو طریقے لوگوں میں رائج ہیں ان میں سے کونسی چیزیں مصلحت کلّی کے مطابق ہیں اور کون اسکے خلاف؟ جو چیزیں اس مصلحت کے مطابق ہوں ان کو مٹانے یا کسی دوسری چیز سے بدلنے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی طرف شوق اور رغبت دلاتے ہیں، ان پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہیں، اور ان کی حکمت و مصلحت سمجھاتے ہیں۔ اور جو چیزیں مصلحت کلّی کے خلاف ہوں اور ان کو مٹا دینے یا بدل دینے کی ضرورت ہو، مثلاً جو بعض انسانوں کے لیے موجب نفع و راحت اور بعض کے لیے موجب نقصان و اذیت ہوں، یا جن کی وجہ سے انسان لذات دنیوی میں منہمک ہو کر عیش کا بندہ بن جاتا ہو، یا جو آدمی کو طریقِ احسان سے ہٹا دینے والی ہوں، یا جو انسان کو جھوٹی تسلّی دیکر دنیا اور آخرت کی مصلحت کے لیے عمل کرنے سے غافل کر دیتی ہوں، ایسی چیزوں کے باب میں انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ

ہے کہ وہ انسان کو دفعتہً ایسی اصلاحات کی طرف نہیں پھیر دیتے جن سے وہ بالکل مانوس نہ ہوں، بلکہ حتی الامکان انہیں ایسے طریقوں کی تعلیم دیتے ہیں جنکے نظائر ان کے درمیان پہلے سے پائے جاتے ہوں۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اختلاف رہا ہے حالانکہ دین ان سب کا ایک تھا۔

بالغ النظر لوگ اس راز کو جانتے ہیں کہ نکاح اور طلاق اور معاملات اور زینت اور لباس اور قضا اور حدود اور تقسیم غنائم کے باب میں شریعت نے بالکل انوکھے طریقے ایجاد نہیں کیے ہیں کہ لوگ پہلے ان کو بالکل نہ جانتے ہوں، بلکہ انہی طریقوں کو باقی رکھا ہے جو پہلے سے رائج تھے اور صرف اُن اجزاء کو بدلا یا مٹایا ہے جو فاسد تھے۔ خون کے بدلے میں دیت کا طریقہ پہلے سے رائج تھا۔ خراج، عشر اور جزیہ سے پہلے بھی دنیا آشنا تھی۔ زانی کو رجم کرنے اور سارق کا ہاتھ کاٹنے اور جان کے بدلے جان لینے کا قانون پہلے سے موجود تھا۔ شریعت محمدیہ نے ان چیزوں کو برقرار رکھا اور صرف ان کو منضبط کردیا۔ مال غنیمت میں رئیس قوم کا حصہ پہلے سے مقرر تھا۔ شریعت محمدیہ نے اس میں تھوڑی ترمیم کرکے پانچواں حصہ معین کردیا۔ البتہ جو چیزیں بالکل ہی غلط تھیں ان کو قطعاً حرام کردیا، مثلاً سود، اور پھلوں کا عیب و صواب ظاہر ہونے سے پہلے ان کو فروخت کرنا۔ اس باب میں اگر تم زیادہ تعمق سے کام لوگے تو دیکھو گے کہ انبیاء علیہم السلام نے عبادات میں بھی جدت طرازی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ زیادہ تر عبادات کے وہی طریقے باقی رکھے ہیں جن سے لوگ پہلے سے مانوس تھے، البتہ ان میں اتنی اصلاح کردی کہ جاہلیت کی تحریفات اور بے اعتدالیاں نکال دیں، اوقات منضبط کردیے، ارکان میں باقاعدگی پیدا کردی، اور عبادت کی ہر صورت کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کردیا۔

رومیوں اور عجمیوں کو جب خلافت ملی اور ایک طویل مدت تک وہ اس منصب پر سرفراز رہے تو لذات دنیا میں گم ہو کر رہ گئے، اور شیطان ان پر ایسا مسلط ہوا کہ زیادہ سے زیادہ اسباب عیش فراہم کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھکر اپنی خوشحالی کی نمائش کرنا ان کی زندگی کا مقصد قرار پاگیا۔ عقل و حکمت

کا استعمال بھی ان کے ہاں بس یہی تھا کہ معاشی انتفاع کے دقیق سے دقیق وسائل تلاش کیے جائیں اور پھر ان سے لطف اٹھانے کے عجیب عجیب طریقے نکالے جائیں۔ ان کے رؤسا اپنی شان ریاست کے اظہار میں جس طرح دولت صرف کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جس شخص کا شمار رئیسوں میں ہوتا ہو اسکے لیے دو لاکھ درہم سے کم قیمت کا تاج پہننا عار کی بات تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک عالیشان محل میں رہے جس کے ساتھ آبزن اور حمام اور باغ بھی ہوں، غلاموں کی ایک فوج اسکی خدمت میں اور قیمتی گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد اسکے اصطبل میں ہو، اس کا دسترخوان نہایت وسیع ہو اور بہتر سے بہتر کھانے اسکے مطبخ میں ہر وقت تیار رہیں۔ ان چیزوں کی تفصیلات تمہارے سامنے بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ اپنے عہد کے امراء و رؤسا کی زندگی میں تم خود وہی رنگ دیکھ رہے ہو۔ غرض یہ کہ یہی چیزیں انکے اصولِ معاش میں گھس گئیں اور ایسی جمیں کہ دلوں سے ان کا نکلنا محال ہو گیا۔ یہ ایک بیماری تھی جو ان کے تمدن کی رگ رگ میں اتر گئی۔ اس کے اثرات بازاروں اور پرگنوں تک پھیل گئے۔ مزدور اور کسان تک ان سے نہ بچ سکے۔ اس نے چند محلوں میں عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے کے لیے ملکوں اور اقلیموں کی بے شمار مخلوق کو مصائب میں مبتلا کر دیا، اس لیے کہ یہ سامان جمع نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ ان کے لیے پانی کی طرح روپیہ نہ بہایا جائے اور اتنی کثیر دولت فراہم کرنے کی اسکے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ تاجروں اور کاشتکاروں اور دوسرے محنت کش طبقوں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جائیں، پھر اگر ٹیکسوں کی زیادتی کے سبب سے تنگ آکر یہ غریب طبقے روپیہ دینے سے انکار کریں تو ان کو فوجوں سے پامال کرایا جائے، اور اگر طاقت سے ڈر کر وہ اطاعت میں سر جھکا دیں تو ان کو گدھوں اور بیلوں کی طرح محنت میں جوت دیا جائے تاکہ وہ رات دن رئیسوں کے لیے دولت پیدا کرنے میں لگے رہیں اور ان کو دم لینے تک کی فرصت نہ ملے کہ خود اپنی سعادتِ دنیا و آخرت کے لیے بھی کچھ کر سکیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں کروڑوں کی آبادی میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملتا تھا جسکی نگاہ میں دین و اخلاق کی کوئی اہمیت ہو۔ وہ بڑے بڑے کام جن پر نظام عالم کی بنا قائم ہے اور جن پر انسانی فلاح و ترقی کا مدار ہے قریب قریب معطل ہو گئے تھے۔

لوگ زیادہ تر یا تو ان صنعتوں میں لگ جاتے تھے جو رؤسا کے لیے لوازم عیش پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں، یا پھر ان فنون اور ان پیشوں کو اختیار کرتے تھے جن سے رئیسوں کو عموماً دلچسپی ہوا کرتی ہے، اسلیے کہ ان کے بغیر کوئی شخص رؤسا کے ہاں درخور حاصل نہ کر سکتا تھا، اور رؤسا کے ہاں درخور حاصل کرنے کے سوا خوشحالی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایک اچھی خاصی جماعت شاعروں، مسخروں، نقالوں، گویوں، مصاحبوں، شکاریوں اور اسی طرح کے لوگوں کی پیدا ہوگئی تھی جو دربار وں سے وابستہ رہتی تھی، اور انکے ساتھ اگر اہل دین تھے بھی تو وہ حقیقت میں دین دار نہ تھے بلکہ کسب معاش کے لیے دین کا پیشہ کرتے تھے تاکہ اپنے دہد کی نمائش سے یا اپنے شعبدوں سے، یا اپنے مکر و فریب سے کچھ کما کھائیں۔ اس طرح یہ مرض ان ممالک میں انسانی جماعت کو اوپر سے لیکر نیچے تک گھن کی طرح کھا گیا تھا۔ اس نے پوری پوری قوموں کے اخلاق گرا دیے تھے اور ان کے اندر رذیل خصلتیں پیوست کر دی تھیں اسکی بدولت انکی سرزمین میں اتنی صلاحیت ہی نہ رہی تھی کہ خدا پرستی اور مکارم اخلاق کا بیج اس کے اندر جڑ پکڑ سکے۔ اس مرض کی حقیقت کا صحیح اندازہ اگر تم کرنا چاہو تو کسی ایسی قوم کا تصور کرو جس میں اس نوع کی خلافت و ریاست نہ ہو، جہاں کھانے اور لباس میں مبالغہ نہ کیا جاتا ہو، جہاں ہر شخص اپنی ضروریات کے لیے خود کافی کام کر لیتا ہو اور اس کی پیٹھ پر ٹیکسوں کا بھاری بوجھ لدا ہوا نہ ہو۔ ایسی جگہ لوگوں کو دین و ملت کے امور پر توجہ کرنے اور تہذیب انسانی کو ترقی دینے کے لیے کافی فراغت اور طمانیت نصیب ہوگی۔ اسکے مقابلہ میں ان لوگوں کی حالت کا تصور کرو جن پر اس نوع کی خلافت و ریاست سوار ہوگئی ہو اور اس نے اپنے خدم و حشم سمیت ملک پر مسلط ہو کر اپنی خدمت لینے کے سوا بندگان خدا کو کسی اور کام کے قابل نہ رکھا ہو۔

جب روم و عجم کے ممالک پر یہ مصیبت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور مرض اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اللہ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس نے اس مرض کا علاج کرنے کے لیے فیصلہ کر دیا کہ مرض کی جڑ کاٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ اس نے ایک نبی امیؐ کو مبعوث کیا جو رومیوں اور عجمیوں سے گھلا ملا نہ تھا اور جس تک انکی عادات و خصائل کا کوئی اثر نہ پہنچا تھا۔ اس کو صحیح اور غلط، صالح اور فاسد میں امتیاز کرنے والی میزان بنا دیا۔ اسکی زبان سے عجمی اور رومی عادات

قیصریت کی مذمت کرائی۔ حیاتِ دنیا میں استغراق اور لذاتِ دنیوی میں انہماک کو مردود ٹھیرایا۔ عجمی عیش پرستی کے ارکان میں سے ایک ایک کو چن چن کر حرام کیا، مثلاً سونے اور چاندی کے برتن، سونے اور جواہر کے زیور، ریشمی کپڑے، تصاویر اور مجسّمے وغیر ذالک۔ غرض یہ کہ اللہ نے اس نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداری سے روم وعجم کی سرداری کا استیصال کردیا اور اعلان کرادیا کہ ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ وھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ۔

اس طرح معیشت اور تمدن کی وہ تمام گمراہیاں جو انسان کی زندگی کو تنگ کرنے والی ہیں اُس ہادیٔ برحق کے ذریعہ سے مٹا دی گئیں۔ خون کے بدلے لینے کا جاہلانہ طریقہ جس کی بنا پر ایک شخص کے قتل کی بدولت دو خاندانوں میں پشتوں تک عداوت چلتی تھی یکلخت بند کردیا گیا۔ میراث جس میں رؤسا قوم اپنے حسب منشا جس طرح چاہتے تھے فیصلے کرتے تھے، اس کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا گیا۔ سود جس کی بدولت ایک شخص کچھ روپیہ دیکر دولت کے ڈھیر کے ڈھیر جمع کرتا چلا جاتا تھا اور دوسرے شخص کی زندگی تنگ ہوجاتی تھی، یکسر حرام کردیا گیا۔ بیع وشراء کے وہ تمام طریقے جن سے ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا نقصان ہو ممنوع ٹھیرا دیے گئے۔ جوئے کی ساری قسمیں حرام کردی گئیں کیونکہ یہ سب انتفاع کے غیر فطری طریقے ہیں۔[۱]

---

[۱] باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ملخصاً